ہے اور بٹنوں تک ہاتھ لے جاتی ہے وہ کہتی ہے قبول کیا العوض ایک گفتگو کے ایک ملاقات کے قبول کیا، ایک مسکراہٹ نصف معجل نصف غیر معجل پر قبول کیا۔ جب چھوٹی لڑکیاں بلوغت کو پہنچتی ہیں، تو وہ سر جھکا کر اور سینہ اندر کر کے بدن کی بولی میں اعلان کرنے لگتی ہیں کہ میں جوان ہو رہی ہوں ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کھڑے گھٹنے پر دوسری ٹانگ کی پنڈلی رکھ کر ٹخنے سے پاؤں گھمانیوالا یا گھمانیوالی یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ کبھی پھر بھی ملنا اور جلدی ملنا اور زیادہ قریب ہو کر ملنا۔ لیکن یہی پاؤں جب فرش پر بار بار بجنے لگتے ہیں اور آوازِ پا اونچی ہونے لگتی ہے، تو بدن اپنی بولی میں کہتا ہے۔ میں بیزار ہو رہا ہوں، میں جا رہا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں۔

مردوں کے مقابلے میں عورتیں بدن بولی سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ سمجھ دار مرد ان کی بات سمجھ جاتے ہیں اور ناسمجھ اپنی گفتگو میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت ان سے مخاطب ہے اور بڑی لمبی بات کہہ رہی ہے اور بار بار کہہ رہی ہے۔ آج کل جب سر میں تیل لگانے اور چوٹی کرنے کا زمانہ نہیں رہا، عورتیں کھلے چھوٹے ہوئے بالوں کے پرے اپنے گالوں پر اُنڈا لاتی ہیں۔ پھر انہیں سر کے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹاتی ہیں۔ ان میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کو تھپتھپاتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں، میرے ہاتھ اس طرح تھپتھپانے کے عادی ہیں اور یہ بھڑکے ہوئے جذبات کو آسودگی بخشتے ہیں۔ سر ایک طرف جھکانا آنکھوں کو گھمانا اور ہونٹوں کی کمان کو گول کرنا یہ کہتا ہے کہ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔ اگلی دفعہ جب ملو گے، تو اس سے بھی اچھے لگو گے پھر میں اپنی بدن بولی کا اگلا باب سناؤں گی، نئی بات بتاؤں گی اور تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو جاؤ گے، اپنے آپ کو پیارے لگنے لگو گے۔ خود کو تھپکنے اور اپنے آپ کو لوری دینے والے کے جواب میں اگر سامنے کا مرد میز پر یا اپنی کرسی کے آرم پر یا اپنی کتاب پر انگلیوں سے تار دینے لگتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اُٹھ کر باہر جا رہا ہوں سٹاپ تم بھی اُٹھ کر باہر آ جانا سٹاپ یہاں بہت سے بیہودہ لوگ بیٹھے ہیں ان کے درمیان جی نہیں لگتا سٹاپ باہر موسم اچھا ہے اور تنہائی ہے۔ کم اینونس۔

مُفتی نے کوہستانی کے ماتھے پر اپنے ہاتھوں کی کنگھی ڈالی ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ عماد نے میری طرف دیکھے بغیر اسی طرح سر جھکائے ہوئے

پھر پوچھا "ہاں شاہ جی تو پھر آپ کیا سوچ رہے تھے"؟

"کوئی خاص بات نہیں"۔ میں نے ہولے سے کہا۔

"کافی خاص بات لگتی تھی"۔ اس نے کہا "آپ کا چہرہ بڑا متفکر تھا"۔

میں نے کہا "ہر دانشور کا چہرہ ہر وقت متفکر ہوتا ہے۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں"۔

دانشور کے لفظ پر وہ زور سے ہنسا اور رُک کر بولا "ایک عام آدمی دانشور کب بنتا ہے"؟

میں نے کہا "عماد اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔ کسی سمسٹر سسٹم کی ضرورت نہیں کوئی امتحان پاس کرنا نہیں پڑتا۔ بس کچھ عرصہ چند دانشوروں کے درمیان بیٹھ کر آدمی خود بھی دانشور بن جاتا ہے"۔

کہنے لگا "شاہ جی میں ایک انجنیئر ہوں اور ساری عمر ایک الیکٹرانک مستری بنا رہا ہوں۔ اپنی سمجھ کے مطابق چند کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ کچھ سمجھ دار لوگوں سے بھی ملا ہوں لیکن میں دانشور نہیں بن سکا"۔

میں نے کہا "سائنس کے طالب علموں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ دانشور نہیں بن سکتے۔ تم لوگ بڑے شوق سے بی ایس سی۔ ایم ایس سی کرتے ہو تاکہ نوکری حاصل کرنے میں آسانی رہے اور تم کو نوکری آسانی سے مل بھی جاتی ہے لیکن اپنی تمام عقلمندی اور فہم و فراست کے باوجود تم دانشور نہیں کہلا سکتے۔ انجنیئر کہلاتے ہو ڈاکٹر کہلاتے ہو جیالوجسٹ کہلاتے ہو لیکن دانشور نہیں"۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "مجھے دانشور بننے کا بڑا شوق ہے اور میں اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہوں لیکن کوئی میری مدد نہیں کرتا"۔

میں نے کہا "اب تو وقت گزر گیا عماد، پھر کبھی سہی، کسی اگلی زندگی میں، کسی اگلے زمانے میں"۔

وہ کچھ دُکھی سا ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ میری طرف گھمایا اور پوچھا "کیا مسعود بھی دانشور ہے"؟

میں نے کہا "یہ اپنا مسعود"؟

"ہاں"۔

"نہیں، یہ دانشور نہیں اور شاید اب ہو بھی نہ سکے"۔

"کیوں؟" عمّاد نے حیرانی سے پُوچھا۔

"اس نے اپنا چانس کھو دیا۔ اگر شروع ہی سے لاہور میں رہتا تو شاید بات بن جاتی۔"

"لیکن یہ شاعری کرتا ہے۔" عمّاد نے وثوق سے کہا۔ "اس کی دو تین غزلیں تو بہت ہی اچھی ہیں۔"

مَیں نے کہا۔ "دانشور ہونے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں۔ مصنّف یا صاحبِ کتاب ہونا لازمی نہیں۔ اس کے لیے ایک سیاسی نقطۂ نظر رکھنا ضروری ہے۔"

"اس کا سیاسی نقطۂ نظر ہے شاہ جی!" عمّاد نے چیخ کر کہا۔ "یہ بڑا مسلمان اور سخت قسم کا پاکستانی ہے اور پاکستان کو سیاسی طور پر ایک طاقتور ملک دیکھنے کا متمنّی ہے۔"

"یہی باتیں اس کے دانشور ہونے کے خلاف جاتی ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "اس لیے کہ مذہب، نیشلزم، ملک اور اقدار سب پُرانے سکّے ہیں۔ انہیں میوزیم میں تو جگہ دی جا سکتی ہے، عالمی سیاسی سوچ اور آفاقی برادری اور بقائے باہمی کے بازار میں نہیں چلایا جا سکتا۔ مسعود کے پاس چونکہ بہت ہی پُرانے سکّے ہیں اس لیے اِن کے ساتھ وہ محلّے کے بچّوں سے 'گھتی پا' تو کھیل سکتا ہے دانشوری کے مونٹی کارلو میں رولے پر داؤ نہیں لگا سکتا۔"

عمّاد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "شاہ جی آپ کمیونسٹ تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" مَیں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا۔

"سوشلسٹ؟" اس نے پُوچھا۔

مَیں نے دلہن کی طرح سر جُھکا کر آہستہ سے "ہاں" کہا اور اپنے فلیٹ بُوٹ میں سے کنکر نکالنے کے لیے زمین پر بیٹھ گیا۔ جب مَیں اُٹھ کر کھڑا ہُوا تو عمّاد ابھی تک ویسے ہی کھڑا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کُھلا تھا اور اس کی گردن ذرا سی جُھکی ہوئی تھی اس نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔ "شاہ جی آپ سوشلسٹ کیوں ہیں؟"

مَیں نے کہا۔ "اِس لیے کہ جب سے رُوس نے چیکوسلوکیہ پر حملہ کیا اور مسٹر ڈوب چک کا مدعا ہی غائب کر دیا اس وقت سے کمیونسٹ ہونے میں کوئی چارم باقی نہیں رہا۔"

"اور جمہوریت؟" اس نے آدھی سی بات کی۔

"جمہوریت کا پہلے پہلے رواج تھا جب کوٹ سُرین سے اُوپر ہوتے تھے اور ان کے لیپل تنگ ہوتے تھے۔ قمیصوں کے کالر چھوٹے اور نوکدار ہُوا کرتے تھے۔ اب فیشن بدل گیا ہے اور مَیں وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ سوشلسٹ ہونا وقت کے ساتھ چلنا ہے۔"

اس نے کہا "آپ وقت کے ساتھ اتنا کیوں چلتے ہیں؟"

مَیں نے کہا "مَیں ٹائم سرور ہوں غلام سرور نہیں۔ وقت کے ساتھ چلنا صحت بخش اور زندگی بخش ورزش ہے۔ اس میں لحمیات اور حیاتین اپنی پُوری مقدار میں ملتے ہیں۔"

"لیکن دوسرے دانشور تو وقت اور زمانے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں شاہ جی!"

مَیں نے کہا "ان کا احتجاج در پردہ اقرار ہوتا ہے۔ عام لوگوں کو اور کم پڑھے لکھے انسانوں کو وہ احتجاج نظر آتا ہے جیسے محکمۂ زراعت کی طرف سے دیواروں پر لکھے ہوئے سلوگن 'پوہلی کو تلف کریں' میں ایک احتجاج نظر آتا ہے اور ایک عام پینڈو یہ سمجھتا ہے کہ محکمۂ زراعت پوہلی کے خلاف جہاد کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہے لیکن حقیقت میں وہ اقرار ہوتا ہے کہ پوہلی ہے اور اسی طرح رہے گی اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

میری بات عمّاد کی سمجھ میں نہ آئی اور اس نے رواروی میں پُوچھا "تو آپ بھی غریبی اور بیماری اور بھُوک کے خلاف اسی قسم کا احتجاج کرتے ہیں۔"

"بالکل" مَیں نے خفت سے جواب دیا "میرا احتجاج بھی 'پوہلی احتجاج' ہے اور اسی چیز نے مجھے دانشور بنایا ہے۔ اگر مسعود چاہے تو وہ بھی 'پوہلی احتجاج' کا اعلان کر کے دانشور بن سکتا ہے۔ غزلیں لکھ کر نہیں۔"

پھر ہم دونوں تیز تیز قدم اُٹھانے لگے اور تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ مُفتی اپنے کوہستانی کی پیٹھ سے اُتر آیا تھا اور دوسروں کے ساتھ قدم قدم چل رہا تھا۔ ہم پہاڑ پر کافی اُوپر چڑھ آئے تھے اور چوٹی کے گرداگرد مسافت کے دائرے تنگ ہونے لگے تھے۔ لیڈر نے اپنی گھڑی دیکھی اور اعلان کیا کہ ہم بیس منٹ آدھ گھنٹہ اس جگہ رُک سکتے ہیں۔ یہ خبر پاتے ہی سب اسی جگہ سرِ راہ بیٹھ گئے اور اعظمی پھُولوں کی تلاش میں آگے نکل گیا۔ کوہستانی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر تنکے سے دانت کریدنے لگا۔ مسعُود نے اپنے تھیلے سے ایک سیب نکالا اور کوہستانی کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو خان! سیب کھاؤ۔" وہ مزے سے دانت کریدتا

اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

"اوے"۔ لیڈر نے چڑ کر کہا۔ "سیب کیوں نہیں کھاتا؟ سیب اچھا نہیں لگتا؟"

"لگتا ہے لگتا کیوں نہیں"۔ اس نے لاتعلقی سے جواب دیا اور پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"حد ہوگئی یار، یہ لوگ سیب پسند نہیں کرتے حالانکہ ان کے اپنے مُلک کا میوہ ہے"۔ لیڈر ہنس کر بولا۔

"اسی لیے نہیں کھاتے میری جان"۔ مُفتی نے کہا۔ "کہ ان کے مُلک کا میوہ ہے۔ اس کو سیب دینا گویا ہمارے گاؤں میں کسی کو ایک بیر دینا ہے"۔

"لو یہ جب بھی کرے گا اُلٹی بات کرے گا"۔ عمر نے کہا۔ "کہاں سیب کہاں بیر۔ کہاں ہیرا کہاں موتی"۔

"مُفتی"۔ مسعود نے مُفتی کو آنکھ مار کر کہا۔ "بس کر۔ اس پر اپنی باتیں ضائع نہ کیا کر۔ یہ لیڈر آدمی ہے اور لیڈروں کا دماغی لیول بس اسی قدر ہوتا ہے"۔

لیڈر غصّے سے لال پیلا ہوگیا اور چیخ کر بولا۔ "تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، گدھا سمجھتے ہو؟"

مُفتی نے کہا۔ "سمجھتے نہیں، تم ہو"۔ اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور اعظمی دُور سے پکار کر بولا: "میرے بعد کیا بات ہوگئی؟ کون کس پر چڑھ گیا؟"

"یہ مُفتی لیڈر پر چڑھ رہا ہے"۔ مسعود نے اُونچی آواز میں جواب دیا۔

"لیکن وہ تو کوہستانی پر چڑھا ہُوا تھا"۔ اعظمی نے زور سے پُوچھا۔

"کوہستانی بھاگ گیا"۔ عماد نے کہا۔ "لیڈر کے بعد تمہاری باری ہے"۔

"حاضر سائیں حاضر"۔ اعظمی وہیں سے بولا اور مسعود کوہستانی کے لیے نکالا ہُوا سیب خود کھانے لگا۔ کوہستانی بڑے بُھورے لُدھر بندر کی طرح پتھر پر بیٹھا ہُوا تھا اور اپنی حضرت عیسیٰؑ ایسی سنہری ڈاڑھی سے تنکے نکال رہا تھا۔

"لو مُفتی جی"۔ اعظمی نے تین بنفشی پھُول آگے بڑھا کر کہا۔ "اِسے ہماری طرف سے اُن کو دے دینا"۔

مسعود نے سوالیہ نگاہوں سے اعظمی کی طرف دیکھا، تو اس نے اپنی قینچی جیسی نگاہیں میرے اوپر گاڑ دیں۔ میں نے کہا: "یہ کوہستانی کا سیب کھا رہا ہے۔"

اعظمی نے کہا: "یہ سیب کی بات نہیں، زیب کی بات ہے۔ کیا نام تھا اُن کا؟"

"کن کا؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"وہی جو دھرمپورے لاہور میں رہتی تھیں؟"

"عالم بی بی۔" مفتی نے یوں کہا جیسے کسی ملک کا دارالخلافہ بتایا ہو۔

"ہاں عالم بی بی۔ عالم بی بی۔" اعظمی کی آنکھیں چمکیں۔ "یہ پھول میں اُن کے لیے لایا تھا۔"

"مفتی۔" لیڈر نے غصّے سے کہا۔ "اس حرامزادی عالم بی بی نے بڑا تنگ کیا ہے، سچ سچ بتا وہ کون تھی؟"

"وہ ایک حرامزادی تھی۔" مفتی نے اطمینان سے کہا اور پڑیا سے ایک پان نکال کر منہ میں ڈال لیا۔

عماد جو پہلے ہم جیسا تھا، لیکن اب بہت زیادہ نیک ہو گیا ہے، عالم بی بی کا نام سُن کر چونکا اور پھر اس کی ناک کے نتھنے اور بڑے ہو گئے۔ مفتی نے اس کے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: "شکر کرو عماد جی بچ گئے ہو ورنہ ہماری طرح سے مارے جاتے۔"

اعظمی نے کہا: "شاید مرا ہُوا آدمی تمباکو کا پان کھا رہا ہے، اگلے جہان جائے گا، تو پہلا سوال قوم کے بارے میں کرے گا۔"

"لیکن مفتی جی۔" مسعود نے کمال سنجیدگی سے پُوچھا: "یہ سب کچھ ہُوا کیسے؟ آپ تو ماشاءاللہ پوتے والے ہیں۔"

مفتی نے کہا: "بے علموں کے ساتھ سیر کرنے میں لُطف نہیں آتا۔ تم لوگ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے اس کو بچے، جوان اور بُوڑھے کے گز سے ناپتے ہو۔ تم سارے درزی ہو۔ آؤٹ فٹر ہو۔ اب کوئی ٹیلر ماسٹروں کو کیسے سمجھائے کہ مرد شروع دن سے لے کر آخر تک مرد ہوتا ہے اور اس کے تمام اعضاء اسی طرح کام کرتے ہیں جیسے پہلے دن کر رہے تھے۔ عمر گزرنے سے کوئی عضو اپنی ڈیوٹی نہیں بدلا کرتا۔"

"لعنت ہو تجھ پر۔" لیڈر نے اس کے سر پر سوٹی مار کر کہا: "اس کا سر سفید ہو گیا، لیکن جوانوں

کی سی سوچ نہ گئی۔"

"اب یہ اپنا عمر ہے۔" مُنّی نے آہستگی سے کہا۔ "یہ کبھی مجھ سے نہیں پُوچھے گا کہ مُنّی جی حیرانی کی بات ہے آپ ستر سال کے ہو گئے، لیکن آپ کا دِل ابھی تک خُون پمپ کرتا ہے۔ آپ کی زبان اب بھی ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ آپ کے گُردے ابھی تک پیشاب بناتے ہیں"۔ پھر وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پان دائیں سے بائیں گال میں بدل کر بولا۔ "یارو، بچّوں پر اور عنفوانِ شباب پر اور جوانی پر اور ادھیڑ عمر کی نفسیات اور جنسیات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن بوڑھوں پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ کسی بھڑوے نے ادھر توجہ ہی نہیں دی۔ دراصل بوڑھے کو ایک فرائیڈ کی شدّت سے ضرورت ہے اور جب تک وہ نیا فرائیڈ پیدا نہیں ہو گا تم جیسے لوگ بے علم ہی مر جائیں گے۔"

مسعُود نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا۔ "اے بابا ہمیں بوڑھوں کے بارے میں کچھ بتا۔"

مُنّی نے کہا۔ "سُنو میرے پیارے بچّو! بُوڑھے دراصل بوڑھے نہیں ہوتے۔ وہ انسان ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کا خوف، اخلاقی اقدار اور لوک لاج بوڑھوں کو ان کی نارمل جنسی زندگی بسر کرنے نہیں دیتی۔ چھوٹوں کی تنقید اور اپنے ہم عصروں کے طعن سے خوفزدہ ہو کر بوڑھا اپنی جنسی زندگی بجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس زندگی کو جو تیس پینتیس بلکہ اس سے بھی زیادہ سالوں سے اس کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہوتی ہے، اس کے بدن کا ایک جزو بن چکی ہوتی ہے، اس کی سائیکی کا ایک حصّہ ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑا دھچکا ہوتا ہے میرے پیارے بچّو اور اس دھچکے کو سہارنا بوڑھے ہی کا کام ہوتا ہے، لیکن یہ ٹوٹ اور یہ تھن چھُٹ کیفیت بوڑھے کو بدمزاج، چڑچڑا، ضدی، ہٹی اور کڑوا بنا دیتی ہے۔ وہ ہر اس شخص سے جھگڑتا ہے جس کو سوسائٹی کی طرف سے جنسی عمل کی اجازت ہو۔ ہر اس فیشن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس سے جنس کو تقویت ملتی ہو۔ پنجرے کا شیر ہر آزاد تماشائی پر دھاڑتا ہے اور دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ دیکھو اس بڈھے کو ہو کیا گیا ہے پوتا گیند بلّا برآمدے میں فرش پر چھوڑ جائے وہ لڑے گا۔ بیٹا نیا پلگ لانا بھُول جائے تو وہ لڑے گا۔ بیٹی فریج کا دروازہ ٹھیک سے بند نہ کرے تو وہ لڑے گا۔ گوالا وقت پر دُودھ نہ لائے تو وہ جھگڑے گا۔ بہُو شلوار میں آزار بند ڈالنا بھُول جائے تو وہ لڑے گا۔ بیوی کل کا آیا ہُوا خط آج دے تو وہ لڑیگا۔ عینک رکھ کر بھُول جائے تو ہر ایک سے جھگڑے گا۔"

"واہ بھئی واہ۔" لیڈر نے تالی بجا کر کہا۔ "سالے کے پاس بیوی ہے پھر بھی لڑتا ہے۔"

"یہی تو بات ہے چن جی۔" مُمتی نے سر ہلا کر کہا۔ "ماچس ہے لیکن گھر والوں نے اسے پانی کی بالٹی میں ڈال دیا ہے۔ کھوکھا بھی گیلا تیلیاں بھی گیلی۔"

"لیکن یار مُمتی۔" اعظمی نے شرارت سے کہا۔ "وہ دھرمپورے والی ماچس تو واٹر پروف تھی۔"

"تھی تو واٹر پروف۔" مُمتی نے اقرار بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن تھی مرسنری ربڑ کی ڈوری سے بندھی تھی۔ ہاتھ آگے بڑھاؤ تو اُچک کر اُوپر چلی جاتی تھی۔ پیچھے ہٹو تو لٹک کر نیچے آجاتی تھی۔ نواسے نواسیوں والی تھی لیکن اپنی بیٹی سے جوان تھی۔"

عماد نے کہا۔ "مُمتی جی بوڑھے کے لیے جوان ساتھی اچھا نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے، ہوتا کیوں نہیں۔" مُمتی چیخ کر بولا۔ "بوڑھا تو بلکہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ وہ عزت میں مشکل میں، بیماری میں، تنگ دستی میں قابلِ اعتماد ساتھی ہوتا ہے۔ اپنے ساتھی کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہے۔ جوانوں کے مقابلے میں چونکہ بوڑھے کی مصروفیات کم ہوتی ہیں اس لیے محبت میں، اختلاط میں اور تشفی میں زیادہ سے زیادہ وقت انویسٹ کر سکتا ہے۔ پھر وہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اپنے ساتھی کو جسمانی طور پر زیادہ خوش رکھ سکتا ہے۔ ہنس لے ہنس لے۔" مُمتی نے سر ہلا کر کہا۔ "دل کھول کر ہنس لے لیکن یہ باتیں میرے بعد تم لوگوں کو کوئی نہیں بتائے گا۔"

مسعود نے عمر کو ایک جھٹکا مارا اور مصنوعی غصے سے کہنے لگا۔ "بدذات مُمتی جی کی باتوں پر ہنستا ہے!"

"ہاں دیکھو یہ ہنستا ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "حالانکہ شالا لوگ عام طور پر مُمتی جی کی باتوں پر ہنستا ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "مُمتی جی یہ تو بکواس کرتے ہیں اور اس وقت سنجیدہ موڈ میں نہیں ہیں۔ آپ مجھے اور عماد کو بتائیں۔"

مُمتی اپنی بات کی لہک میں کہنے لگا۔ "بوڑھے کی راہ کا سب سے بڑا روڑا اس کی شکل ہوتی ہے۔ اس کی ہیئت ہوتی ہے۔ ناک لمبی ہو کر آگے کو جھک جاتی ہے۔ آنکھیں تنگ ہو جاتی ہیں، چہرہ جھریوں سے اٹ جاتا ہے۔ اس کے جسم کے خلیے کم ہونے لگتے ہیں لیکن وہ اس وقت

تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کے ہونٹوں پر سوال نہ آئے۔"

"سوال کیسا؟" عمر نے بے چین ہو کر پوچھا۔

مُفتی نے کہا "بُوڑھے کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگتا ہے جب وہ کسی عورت سے ملاپ کا خواہش مند ہو۔ اس کا اظہار کرے اور پھر اس کو صاف انکار کر دیا جائے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح اس انکار کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، شور نہیں مچاتا، چُپ چاپ خاموشی سے سُن لیتا ہے اور پی جاتا ہے۔ اس انکار کے بعد وہ اپنے گرد و پیش سے اپنی خوراک سے، اپنے لباس سے لاتعلق ہو جاتا ہے، اور ایک دن اپنے کپڑے اُٹھا کر گھر کے کسی کمرے میں جاتا ہے اور وہاں جا کر خاموشی سے مَر جاتا ہے۔"

مجھے یاد آیا ہمارا ایک یار تھا خواجہ رفیق۔ جب میری اور اس کی دوستی ہوئی اس کی عمر اکسٹھ برس کی تھی اور میں اپنی زندگی کی اٹھائیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ میری اور اس کی دوستی ایک نسخے اور ایک لڑکی کے سلسلے میں ہوئی۔ خواجہ کے پاس کچھ پُرانے صدری نسخے تھے جن میں سونا بنانے اور ہمزاد کو قابو میں کرنے سے لے کر ایک دن میں چھونے اور تین گھنٹے میں گوہارنی ختم کرنے کے نسخے تھے۔ میری ایک عزیزہ شب کور تھیں اور یاسین نے مجھے خواجہ کا پتہ دیا تھا۔ یاسین کراچی میں متوسط درجے کی لڑکیاں سپلائی کرتا تھا اور اس کا فلیٹ گاندھی گارڈن کے قریب تھا اس کے گھر ایک مرتبہ ہم نے جس لڑکی کو پسند کیا تھا وہ دراصل خواجہ کی رکھیل تھی اور اس کے سوا اور کسی کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔ اس لڑکی کا قد لمبا رنگ سانولا اور ماتھا تنگ تھا۔ آنکھوں میں شرارت گردن پر تل اور ایک نتھنے پر پھوڑے کا نشان تھا۔ اس نشان نے اس کی ناک میں مستقل طور پر ایک کوکہ ڈال رکھا تھا اور جب وہ بات کرتی تھی تو یہ کوکہ گرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب ہم نے ذرا شوخ ہو کر اس سے بات کی تو وہ اِٹھلا کر بولی "میں خواجہ جی کو بتلا دوں گی۔" پھر ہم نے یاسین سے خواجہ کے متعلق پوچھا اور یاسین نے بتایا کہ خواجہ ایک مقامی فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے اور اس کے دو بیٹے کویت میں کام کرتے ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں جن میں سے دو شادی شدہ ہیں اور لیبیا میں اپنے خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ تیسری راولپنڈی میں لیکچرار ہے۔ خواجہ اکیلا کراچی میں رہتا ہے۔ دن بھر اکاؤنٹنٹی کرتا ہے رات عورت کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ دِل کا بھی بُرا ہے اور نیت کا بھی۔ حاسد بھی ہے اور ظالم بھی۔ تنگ نظر ہے، لیکن

خوب خرچ کرتا ہے۔ بدشکل ہے لیکن محبوب طبیعت ہے۔

ہم شب کوری کا نسخہ حاصل کرنے کے لیے یاسین کے ساتھ خواجہ کے فلیٹ گئے تو وہ ریشمی تہہ بند باندھے چارپائی پر لیٹا تھا اور ایک عورت اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ خواجہ جلدی سے اُٹھا اور اس نے قریب پڑی ہوئی کرسی سے اپنا کرتہ اُٹھایا۔ اسے پہنا پھر عورت سے کہنے لگا "اب تو جا صغراں کل اسی وقت آجانا"۔ صغراں کسی تکلف کے بغیر چارپائی سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ یاسین نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہمارے یار ہیں اور بڑے دل والے آدمی ہیں کسی دفتر میں لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں"۔ مَیں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو خواجہ نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنا زانو زور سے ہلانے لگا۔ خواجہ کا قد چھوٹا اور رنگ سانولا تھا۔ ماتھا تنگ اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ نہ ان میں نُور تھا نہ روشنی۔ کُھلی بھی بند دکھائی دیتی تھیں۔ چھوٹی سی ناک کے نیچے ٹوتھ برش ایسی مونچھیں تھیں جن پر چمکدار خضاب کی وارنش تھی۔ سَر کے بال کالے اور سفید تھے اور بوتل صاف کرنے کے بُرش کی طرح کھڑے تھے۔ خواجہ جب ان پر ہاتھ پھیرتا تو آواز سی بھی آتی تھی۔ اس کے ایک کان میں چھید تھا اور دُوسرا ذرا سا اندر کو مُڑا ہُوا تھا۔ ٹھوڑی پر زخم کا نشان تھا اور جبڑے کی ہڈی بہت ہی چھوٹی تھی۔ چہرے کی جلد ضرورت سے زیادہ کسی ہوئی تھی اور نتھنے کھنچے ہوئے تھے۔ بازُو لمبے تھے اور ہاتھ چھوٹے اور اُنگلیوں کے پوٹے بندروں کی طرح آگے سے گول اور چمکدار تھے۔ گو وہ بڑے آرام سے چارپائی پر بیٹھا تھا، لیکن اس کا سارا وجود ایک پھرکی کی طرح گھومتا ہُوا لگتا تھا۔

یاسین نے کہا "یہ آپ سے کوئی نسخہ لینے آئے ہیں"۔

"کیسا نسخہ؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پُوچھا۔

"شب کوری کا"۔ مَیں نے گلا صاف کر کے کہا۔

"کون بیمار ہے؟"

"میری بھانجی ہے"۔

"کس عمر کی ہے؟"

"اکیس بائیس برس کی"۔

"اس کی شادی کر دو"۔

مَیں نے یاسین کی طرف اور یاسین نے میری طرف دیکھا اور کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

خواجہ کے اس چھوٹے سے جملے سے مجھ میں یلغار کی قوت پیدا ہوگئی اور مَیں نے منہ پکا کر کے کہا: "خواجہ جی کسی دن تازی کو ہمارے لیے بھی چھٹی دے دیں۔" وہ خاموش رہا۔ مَیں نے پھر کہا: "بس ایک دن کے لیے۔"

خواجہ نے چہرہ میری طرف پھیرا اور ہولے سے بولا: "جوان، وہ میری پابند ہے۔ اس کو چھٹی نہیں مل سکتی۔"

مَیں نے کہا: "ہم رقم خرچ کریں گے۔"

کہنے لگا: "پوچھ کے دیکھ لو جوان اگر وہ رقم کی شوقین ہے تو لے جاؤ۔"

یاسین نے کہا: "توبہ ہے خواجہ جی۔ وہ آپ کی پابند ہے رقم کی نہیں۔"

مَیں نے کہا: "آپ میں کیا صفت ہے؟"

خواجہ بولا: "مَیں پھرکی ہوں۔ سارے پر گھوم جاتا ہوں جوان۔ کرلو گے؟"

مَیں نے کہا: "کیوں نہیں۔"

ہنس کر بولا: "تم نوجوانوں کو تو کان میں اُنگلی پھیرنا ٹھیک سے نہیں آتا تم کیا گھوموگے!"

مَیں کچھ شرمندہ سا ہوگیا تو کہنے لگا: "اسے رضیہ سے ملانا تھا یاسین۔ منیرا سے ملانا تھا۔"

"ان سب سے تو مل لیے خواجہ جی۔" یاسین نے آہستہ سے کہا۔

"اب تازی پر دل آگیا ہے۔" مَیں نے فقرہ مکمل کیا۔

خواجہ صاحب نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: "دیکھ لو۔ اس کی مرضی ہے مَیں کچھ نہیں کہتا۔"

مَیں نے کہا: "اور شب کوری کا نسخہ۔"

اس نے کہا: "وہ مَیں نے تم کو بتلا دیا ہے۔ اس عمر میں اگر لڑکی کو رات کے وقت نظر نہ آئے تو آسان اور سستا علاج شادی ہے۔" پھر اس نے یاسین کی طرف دیکھے بغیر اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پوچھا: "کتنے پیسے تھے تمہارے میرے ذمے۔"

"تیرہ خواجہ جی۔" یاسین بولا۔

خواجہ جی نے پانچ پانچ کے تین نوٹ نکال کر اس کو دیئے اور کہا "یہ سارے رکھ لے جوان پھر کبھی حساب کریں گے"۔

چلتے وقت جب مَیں نے اپنا ہاتھ خواجہ جی کی طرف بڑھایا تو انہوں نے دیکھا نہیں۔ پُتلی پر نظریں جمائے اسی طرح بیٹھے رہے۔ خواجہ جی سوَر کی طرح گردن نہیں گھما سکتے تھے۔

اس کے بعد خواجہ جی سے ہماری یاری ہوگئی اور ہم ان کے یہاں روز آنے لگے۔ ان کے فلیٹ کے ایک کمرے پر تقریباً ہمارا قبضہ ہوگیا اور ہم نے یہاں راتیں بسر کرنا بھی شروع کر دیں۔ تازی کے ساتھ ہمارا بہنا پا ہوگیا اور وہ ہمیں سجنی کہہ کر بُلانے لگی۔ تازی کون تھی اور اس کے گھر والے کیا کرتے تھے اور اس کا جغرافیہ کیا تھا اس کی خبر نہ ہم کو تھی نہ خواجہ صاحب کو۔ وہ تین چار گھنٹے کے لیے ہر روز اُن کے پاس آتی اور دونوں چارپائی پر لیٹ کر دیر دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔ پھر وہ اُٹھ کر چائے بناتی مجھے آواز دیتی۔ ہم تینوں چائے پیتے اور وہ بُرقعہ اوڑھ کر گھر چلی جاتی۔ مَیں نے اُسے بارہا خواجہ جی سے تحفے تحائف اور رقم وصول کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ اس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ لیتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا شوق ٹانسے کی چادر اُوپر ڈال کر خواجہ صاحب کے ساتھ لیٹنا تھا۔ یہ چادر گھر کی دُھلی ہوئی ایک عام سی چادر تھی جو بڑے جشنے کی سردارنیاں اور جاگیر دارنیاں لیا کرتی ہیں۔ اس پر نہ کوئی پھول کڑھے تھے نہ اُس میں کوئی خوشبو تھی نہ اس کا رنگ ہی جاذب تھا، لیکن اس کے نیچے لیٹنا اور اُس کو اپنے بدن پر محسوس کرنا تازی کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ یہ چادر خواجہ کو اس کے بیٹے نے اُور کپڑوں کے ساتھ کویت سے بھیجی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے نیچے ابا جی کا تنگ وجُود بھی شامیں گزارا کرے گا۔ پھر سجنی اور تازی کی زندگی میں ایک مہینہ ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں کو خواجہ کے فلیٹ سے ویسں نکالا مل گیا۔ خواجہ کا ایک رشتے کا پوتا اپنی بیوی کے علاج کی غرض سے کراچی آرہا تھا اور اسے مہینہ ڈیڑھ مہینہ اپنے دادا کے پاس ٹھہرنا تھا۔ تازی پر جُدائی کے یہ دن قیامت بن کر ٹوٹے اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ مَیں اسے اپنے ساتھ لپٹا کر تسلیاں دے رہا تھا۔ خواجہ کُرسی پر بیٹھا مُٹھیوں میں پھونکیں مار رہا تھا اور تازی روئے جا رہی تھی۔ مَیں نے کسی ناروتی ہوئی عورت کا جسم بھی اس قدر مضبوط اور سڈول نہ دیکھا تھا۔ اس کے کندھے اور گات اور گردن میسی فرگوسن کے بڑے ٹائر کی طرح سخت تھے، لیکن ان میں لچک کا احساس موجود تھا۔

خواجہ صاحب کا پوتا مع اپنی بیوی کے آگیا۔ اس کا جسم تندرست، قد اُونچا، بال گھنگریالے اور ہاتھ مضبوط تھے۔ وہ عارف والے کی کبڈی ٹیم کا کپتان تھا اور اس کے اڑنگے میں آئے ہوئے میانوالی کے جوان بھی اپنا آپ نہ چھڑوا سکتے تھے۔ اس کے ایک دانت پر سونے کا پترا چڑھا تھا اور اس کے ہونٹ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاہی مسجد کے مینار کو کسی نے تار کے بُرش سے رگڑ رگڑ کر دھو دیا ہو۔ اپنے دادے کی طرح وہ بھی شوقین مزاج نوجوان تھا اور دو ہی تین ملاقاتوں میں میرے ساتھ گھُل مل گیا تھا۔ ایک دن ہم دونوں خواجہ کی آنکھ بچا کر درمیانی عمر کی دو عورتوں کو سیر کرانے ہَوا بندر لے گئے۔ ساحل ساحل چلتے وہ دونوں ہم سے بہت دُور نکل گئے اور میں اور میری عورت ریت پر سیپیاں اور گھونگے چُنتے رہے۔ اس عرصے میں کئی لہریں آئیں اور گزر گئیں۔ کئی جہاز دُور سے نظر آئے اور پھر غائب ہو گئے۔ کئی گروہ سیر کے لیے آئے اور واپس چلے گئے۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئے۔ ان کے بالوں میں اور ان کے چہروں پر اور ان کی گردنوں پر خشک اور گیلی ریت چمٹی ہوئی تھی۔ حالانکہ کراچی میں کبڈی کھیلنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔

یہ نوجوان کوئی ڈیڑھ مہینہ خواجہ صاحب کے یہاں مقیم رہا اور اس عرصے میں خواجہ صاحب اپنی بہُو کا خود ہی علاج کرتے رہے اور وہ صبح گاندھی گارڈن کے چڑیا گھر سے طلوع ہوئی جب اس نوجوان کی بیوی ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھی اور اس نے غسل خانے میں جا کر قے کرنا شروع کر دی اس کا بدن چھوٹے چھوٹے دھچکوں سے دُہرا تہرا ہو رہا تھا اور وہ سنک کے دونوں کناروں کو پکڑ کر رو رہی تھی۔ ابکائیاں کر رہی تھی، کراہ رہی تھی، زور زور سے پاؤں زمین پر مار رہی تھی۔ نوجوان گھبرا کر اُٹھا اور خواجہ جی کے کمرے میں جا کر بین کرنے لگا۔ "باباجی اُٹھو، رضیہ کو کچھ ہو گیا ہے۔ اس کو قے اِس آ رہی ہیں اور وہ مرنے لگی ہے۔ اسے کچھ دیں۔ اسے دیکھیں۔ اسے کیا کریں باباجی"؟

خواجہ صاحب نے لیٹے لیٹے اپنے خارپشت سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "جب وہ فارغ ہو جائے تو اُسے کہنا چائے کے لیے پانی رکھ دے میں آج کشمیری چائے بناؤں گا۔" نوجوان کا دل اس شفقی بوڑھے کی بات پر دو نیم ہو گیا اور اس نے غسل خانے میں جا کر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ پھر وہ دو دن اور خواجہ جی کے گھر رہے لیکن اس مدّت میں نوجوان نے سنگدل بوڑھے

سے کلام تک کرنا گوارا نہ کیا۔

یہ ڈیڑھ مہینہ تازی پر بہت گراں گزرا۔ گو اس عرصے میں اس کی خواجہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن یہ ملاقاتیں ٹاٹ کی چادر میں لپٹی ہوئی نہ ہوتی تھیں۔ یاسین کے فلیٹ میں پٹرتل کے ایک پرانے پلنگ پر ہوتی تھیں جس کی نواڑ کے اندر بہت سے کھٹملوں کے گھر تھے۔

میں نے کسی من موہنی لڑکی کو ایسی اُجاڑ صورت اور اس طرح سے ویران حال کبھی نہیں دیکھا۔ وہ یاسین کے فلیٹ میں پہنچ کر گھنٹوں خواجہ جی کا انتظار کیا کرتی، لیکن خواجہ جی کا کوئی پتہ نہ چلتا۔ پھر وہ زور زور سے رونے لگتی اور ہمارے پاس اُسے چُپ کرانے کے لیے کوئی جھنجھنا نہ ہوتا۔ وہ خاموش ہو جاتی تو اسے ہنسانے کے لیے ہمارے پاس وہ اُنگلیاں نہ ہوتیں جن کے پوٹے گول اور جلد لچکیلی اور نشاک ہوتی۔ یاسین کے لیے وہ لڑکی مصیبت بن گئی تھی اور اس کو دیکھ کر اس کی دوسری لڑکیاں بھی متاثر ہونے لگی تھیں۔

جب خواجہ جی کا پوتا اور اس کی بہو کراچی سے گئے تو تازی کے سُوکھے دھانوں پر پانی پھرا اور وہ پھر سے تروتازہ ہو گئی۔ پہلے ہی روز جب وہ خواجہ کے کمرے میں آئی تو اس کے پاس مختلف سائز کے کاغذوں کی تین پرچیاں تھیں جن پر اس نے اس ڈیڑھ مہینے کے دُکھوں، طعنوں، جلاپوں اور حسدوں کے نوٹس تیار کر رکھے تھے۔ وہ باری باری سے ہر ایک پر جواب مضمون لکھ سکتی تھی اور اسی نیت سے وہ یہ کاغذ لے کر خواجہ کے پاس آئی تھی۔ جب چارپائی پر لیٹے ہوئے خواجہ نے اُسے لیٹنے کے لیے کہا تو وہ سختی سے بولی: "نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں کرسی پر۔ مہربانی۔"

خواجہ نے بڑی محبت اور ملائمت سے کہا: "لیکن میری جان میرا کوئی قصور، کوئی خطا؟ ایسی ناراضی۔"

تازی نے پرچی نکال کر کہا: "جس دن تمہارے مہمان آتے ہیں اس شام تم نے یاسین سے کہا تھا کہ میں کل سویرے آؤں گا تازی کو بتا دینا۔ میں آئی، لیکن تم نہیں آئے۔ میں تمہارے باپ کی نوکر یا تمہارے خاندان کی غلام تھوڑی تھی کہ دن بھر تمہارا انتظار کرتی رہتی۔"

خواجہ نے اس کا فقرہ آدھا سُن کر کروٹ بدلی اور مُنہ دیوار کی طرف کر کے آنکھیں بند کر لیں جب اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں، تو اس کے کان خود بخود ساتھ ہی بند ہو جاتے تھے۔ تازی نے غصے میں

پرچی کی گولی بنا کر کونے میں دے ماری۔ دونوں پاؤں ایک ساتھ اوپر اٹھا کر فرش پر دے مارے اور کرسی کو لات مار کر کھڑاک سے زمین پر گرا دیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور وہاں سے فلائنگ کک مارتی ہوئی خواجہ کے ساتھ چارپائی پر وہاں آ گری جہاں کروٹ بدلنے سے جگہ خالی ہو گئی تھی۔ تازی نے اپنے دانت پوری قوت سے خواجہ کے بازو میں گڑو دیئے خواجہ چیخ مار کر تکلے کی طرح گھوما اور پھرکی کی طرح گھومتا چلا گیا۔

اگلے چھ مہینے کے واقعات بڑے سازگار، خوشگوار اور یادگار قسم کے تھے۔ ان کی تفصیلات بہت لمبی اور ان کی جزئیات زرہ بکتر کی کڑیوں کی طرح ذہن کے وجود سے چمٹی ہوئی ہیں۔ انہیں الگ الگ کر کے نہیں دکھایا جا سکتا۔ اس عرصے میں ہم تینوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے اور ہماری دوستی کے درمیان سے ہوا بھی اچھی طرح سے نہ گزر سکتی تھی۔ ایک اتوار ہم تینوں خواجہ کے فلیٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے کہ خواجہ نے تازی کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا "جن مکھنو اپنا ہمزاد دیکھو گے"؟

تازی کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا "کون ہے، کدھر ہے، کہاں ہے"؟ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر پوچھا "کون آیا ہے"؟

خواجہ نے ہنس کر کہا "ہمزاد بے وقوفے! تیری سوکن نہیں۔ اصل ہمزاد جو قابو کیا جاتا ہے"۔

یہ بات کچھ اس کی سمجھ میں آئی کچھ نہ آئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی سر ہلا کر کہا "خواجہ جی ٹھیک سے میں بھی نہیں سمجھا" خواجہ نے تازی کی ران پر پٹاخ سے ہاتھ مار کر کہا "چلو اٹھو۔ آؤ میرے ساتھ"۔

"کہاں"؟ تازی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"او ہو آؤ تو سہی، ڈرتی کیوں ہو"۔ خواجہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے تازی کی کلائی پکڑ کر اسے بھی اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ خواجہ نے الماری کھول کر اندر سے اپنی پھندنے والی رومی ٹوپی نکالی اور اسے سر پر رکھ کر بصرے کی نوکری جانے والے کی طرح بتیسی نکالنے لگا۔ ہم دونوں خاموشی سے اس کا منہ تک رہے تھے۔ پھر وہ پلٹا اور غسل خانے میں جا کر وضو کرنے لگا۔

نچڑتی ہوئی کمینوں اور ٹپکتی ہوئی ٹھوڑی کے ساتھ وہ غسل خانے سے برآمد ہُوا اور ہم دونوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اور ہم بھی قدم قدم اس کے پیچھے زینہ چڑھنے لگے۔ چوتھی منزل ختم ہونے پر اُوپر کی چھت آ گئی۔ دُھوپ چمک رہی تھی اور آسمان بالکل صاف تھا۔ پانی کی ٹینکی کے لمبے چبوترے کا سایہ فرش پر پڑ رہا تھا۔ یہ سایہ کوئی دس بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس کے بعد دھوپ ہی دھوپ تھی۔ خواجہ نے کچھ کہے بغیر مجھے کندھوں سے پکڑا اور چھاؤں میں اس طرح سے کھڑا کر دیا کہ میری گردن کا سایہ دھوپ اور سائے کی حد پر پڑتا تھا۔ میرا سارا وجود سائے میں تھا صرف سر اور گردن کی چھاؤں چھت کے فرش پر نظر آ رہی تھی۔

پھر اس نے میرے سر کو اس طرح سے جُھکایا کہ میری نگاہیں اپنے پاؤں پر جم گئیں۔ اپنا دایاں ہاتھ میرے بائیں کندھے پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا اور پانچ دس منٹ تک اسی طرح پڑھتا رہا۔ پھر اس نے میری ٹھوڑی کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر میرا سر اُوپر اُٹھایا اور مَیں نے چمکتی دھوپ میں اپنے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر دیکھا۔ وہاں مَیں کھڑا تھا۔ وہی کپڑے وہی کھڑے ہونے کا انداز وہی چہرہ، ویسے ہی بال۔ مَیں وہاں کھڑا مسکرا رہا تھا اور مَیں یہاں کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ مَیں نے مرعوب ہو کر اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُسے سلام کرنے کی کوشش کی اور مَیں وہاں کھڑا ہُوا اور شدّت سے اور شرارت سے مسکرانے لگا۔ پھر مَیں نے اُسے دائیں بائیں جُھولتے دیکھا جیسے وہ گنگنا رہا ہو اور مَیں نے یہاں یہ محسوس کیا جیسے مَیں کانپ رہا ہوں اور رونے لگا ہوں۔ خواجہ نے میرا سر اپنے ہاتھ سے پھر نیچے دبا دیا اور کچھ پڑھ کر تین مرتبہ تالی بجائی۔ پھر اس نے میری کمر تھپتھپائی جیسے کہہ رہا ہو "بس اب جاؤ۔"

مَیں نے سر اُٹھا کر ڈرتے ڈرتے سامنے دیکھا۔ اب مَیں وہاں نہیں تھا۔ پھر خواجہ نے آگے بڑھ کر تازی کا بازو پکڑا اور اُسے سائے کی طرف کھینچا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور خواجہ کا ہاتھ زور سے جھٹک کر "مَیں نہیں، مَیں نہیں" کہتی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ شاید وہ میرا چہرہ دیکھ کر ڈر گئی تھی اور اُسے خواجہ سے خوف آنے لگا تھا۔ خواجہ ایک قہقہہ مار کر ہنسا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔

خواجہ نے جادو ٹونا اور کالا علم ناگا قبیلوں سے سیکھا تھا جب وہ فوج میں بھرتی ہو کر آسام گیا تھا۔ وہاں ایک ناگا عورت سے اس کی آشنائی ہو گئی تھی اور وہ اس کے بڑے بیٹے کا دوست

بن گیا تھا جو عمر میں خواجہ سے تین سال بڑا تھا۔ خواجہ بتاتا ہے کہ مگاچو بڑے قد کاٹھ کی گرانڈیل عورت تھی اور اس کی بائیں ران پر آدمی کی شکل کا ایک بڑا سا مسا تھا۔ اس کا خاوند ہاتھی پکڑنے کا کام کرتا رہا تھا اور ہاتھیوں کی بولی آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ مگاچو کہتی تھی کہ اس کے خاوند کے جوان اور جنگلی ہتھنیوں سے تعلقات تھے اور وہ اس کو دیکھ کر دُور سے سُونڈیں ہلانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس کے لڑکے کو اپنی ماں کی یہ بات بڑی ناگوار گزرتی تھی لیکن خواجہ اس سے بڑا لُطف لیا کرتا کیونکہ ایسے قصّے بیان کرتے ہوئے مگاچو غصّے سے اور حسد سے سبز ہو جایا کرتی اور اس کی آنکھیں ٹیڑھی ہو کر اُوپر کو چڑھ جاتی تھیں۔ وہ جوان ہتھنیوں کے لیے حرامزادیاں، کٹنیاں، چُل بھریاں کے الفاظ استعمال کیا کرتی اور ان کے ذکر سے اُس کی آنکھوں میں غصّے اور نفرت اور دُکھ کے آنسو آجایا کرتے تھے۔ وہ اپنے خاوند کو یاد کر کے کبھی نہ روتی تھی۔ اس کی بیوفائی اور بے اعتنائی اور اکیسٹرا میریٹیل ریلیشنز کو یاد کر کے گھنٹوں آنسو بہایا کرتی تھی۔ یہ آدمی اس نے بڑی محنت اور بڑی قربانیوں کے بعد جیتا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا دل ایک مچھیرن سے توڑ کر اپنی طرف کیا تھا۔ آٹھ سال تو اچھی طرح سے گزرے اور اس عرصے میں ان کے تین اولادیں بھی ہوئیں اور وہ مل کر کھیلا کرتے اور ہاتھی پکڑتے رہے لیکن ایک چاندرات کو جب وہ تازہ پکڑی ہوئی ہتھنی کی وحشت کا معائنہ کرنے کے لیے گڑھے میں اُترا تو جوان ہتھنی نے اس کے بدن پر اپنی مستک چھیرنی شروع کر دی اور خود لذّت سے کانپنے لگی۔ مگاچو کنارے پر کھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اپنے خاوند کو ہتھنی کے سامنے عاجزی اور لذّت سے سر جُھکائے عجیب و غریب آوازیں نکالتے سُنتی رہی پھر مگاچو سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ایک بڑا پتھر اُٹھا کر ہتھنی کے سر پر دے مارا۔ ہتھنی نے درد سے تو کم لیکن اپنی خلوت میں کسی کے مُخل ہونے سے بلبلا کر ایک چیخ ماری اور مگاچو کے خاوند کو سُونڈ میں لپیٹ کر اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا۔ سوتن کا یہ روپ دیکھ کر مگاچو وہاں سے روتی بین کرتی اپنے بال کھسوٹتی قبیلے کی طرف بھاگ گئی اور پھر ان میاں بیوی کے درمیان غیریت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

خواجہ کہتا ہے کہ مگاچو بتایا کرتی تھی کہ جس رات اس کا خاوند اور ایک نوجوان ہتھنی گھنے جنگل میں ایک دوسرے سے مساس کر رہے تھے، ایک بوڑھا ہاتھی دبے پاؤں ادھر آنکلا۔ اس نے مبلا کے باپ کو پھُول کی طرح اپنی سُونڈ میں اُٹھایا اور اپنے بدن کے دھکّے سے ہتھنی کو

زمین پر گرا دیا۔ ہتھنی بلبلا کر اُٹھی اور اپنی سُونڈ بڑھا کر مگاچو کے خاوند کو بڈھے ہاتھی سے چھڑانا چاہا، لیکن اُس وقت تک بدنصیب انسان مضبوط سُونڈ کے تنگ ہوتے ہوئے حلقے میں پھنس کر دم توڑ چکا تھا اور اس کی ساری پسلیاں چُورا ہو گئی تھیں۔ نوجوان ہتھنی نے ہاتھی کے کان کے گرد اپنی سُونڈ ڈال کر اُسے زور سے کھینچا اور بُڈھے ہاتھی کا سارا کندھا خُون سے لت پت ہو گیا۔ پھر ان دونوں میں باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ صبح قبیلے کے لوگوں نے مگاچو کے خاوند کی تلاش شروع کی، تو گھنے جنگل میں موٹی دلدل والی جھیل کے پاس ہتھنی مری پڑی تھی۔ اور اس کے بدن پر چرے ہوئے فیل شکاری کے بڑے بڑے لوتھڑے چمٹے ہوئے تھے۔ اُونچے درختوں پر گدھوں کے قافلے اُتر آئے تھے اور دلدل والی جھیل کے درمیان ایک بُوڑھے ہاتھی کا جہاز ایسا جسم غرق ہو رہا تھا۔ بُلبلے اُٹھ رہے تھے اور پتلے گارے کی تہیں بھنور بنا رہی تھیں قبیلے کے سیانے نے سارے حالات کا جغرافیائی مطالعہ کرنے کے بعد مگاچو کو یہ کہانی سُنائی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بُوڑھے ہاتھی نے فتح پانے کے بعد خودکشی کیوں کر لی تھی!

جس دن بلبلا کا باپ مرا اُسی دن آدھی رات کے وقت مگاچو کی بائیں ران پر زور کی کھجلی اُٹھی اور وہ رات بھر خارش کی شدت سے چیختی اور کلبلاتی رہی۔ صبح جب اُس نے اپنی ران کھول کر دیکھی تو اس پر ایک بڑا سا سیاہ مسا تھا جس کی صورت آدمی کے چہرے سے ملتی تھی اور یہ چہرہ بلبلا کے باپ کی شکل سے ملتا تھا۔ خواجہ بتایا کرتا تھا کہ جب میں اس چہرے پر ہاتھ پھیرتا تو مگاچو بہت خوش ہوتی اور اس کی آواز میں فاختہ کی کوکو سی پیدا ہو جاتی۔

ساڑھے تین سال خواجہ ملٹری کا بھگوڑا رہا اور یہ ساری مدت اس نے مگاچو کے جھونپڑے میں اس کے بڑے بیٹے بلبلا کے ساتھ گزار دی۔ اچھا کھانا، اچھی شراب پینا اور رات کو مگاچو کے ساتھ لپٹ کر سو جانا۔ مگاچو قبیلے کی دوسری عورتوں کی طرح کوئی کام نہ کرتی تھی۔ اس کا پیشہ کالا علم تھا اور وہ جادو ٹونے ٹوٹکے کے لیے دُور دُور تک مشہور تھی۔ اس پیشے سے اس کو اتنی آمدنی ہو جاتی کہ وہ تینوں دن عیدوں اور راتیں شبراتوں کی طرح گزارتے اور ہر وقت نشے میں جھومتے رہتے۔

اس اثنا میں جنگ بند ہو گئی اور ایک جرمن جوڑا کسی جغرافیائی مہم کے سلسلے میں یہاں خیمہ زن ہُوا۔ لڑکی دن بھر ٹائپ کیا کرتی اور اس کا ساتھی ایک چھوٹی سی گینتی اور کلہاڑی لے کر جگہ جگہ سے زمین کھود کر دیکھا کرتا۔ گہرے پیلے رنگ کے خیمے کو سُرخ گوٹ لگی تھی اور بھورے

رنگ کے جمپر اور ورسٹڈ کے سکرٹ میں سنہرے بالوں اور گلابی بدن والی لڑکی بند تھی۔ اس کے بازو کھلے تھے اور پنڈلیوں تک چمڑے کے بڑے بوٹ تھے۔ جتنی انگریزی اس کو آتی تھی خواجہ اس سے بہت زیادہ جانتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا کرتے اور خواجہ گھما پھرا کر ہر بات اپنے اور مگاچو کے تعلقات کی تفصیل پر لے آیا کرتا۔ وہ پنسل ڈائری نکال کر اس میں نوٹس لیا کرتی اور اس کا ساتھی گیتی اور کلہاڑی کے شوق میں بہت دُور نکل گیا ہوتا۔ پھر وہ تینوں سٹوو لیمپ جلا کر کالی کافی بناتے اور بغیر شکر کے پیتے۔ خواجہ نے چونکہ کالا علم نیا نیا سیکھا تھا اس لیے اس نے اپنا پہلا آزمائشی وار اس جرمن لڑکی پر کیا اور ایک ہفتے میں کامیاب ہو گیا۔ خواجہ کے اصرار پر جب مگاچو پہلی بار اس کے خیمے میں گئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔ خواجہ ترجمان کے فرائض سرانجام دیتا رہا، لیکن دونوں ایک دوسری کی نگاہوں کو تکتی رہیں۔ ایک دُوسری کی بدن بولی کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ شام کو جب خواجہ جھونپڑے میں آیا، تو مگاچو نے کھکھری نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا: "مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے، لیکن اس بھوری بندریا سے ذبح نہ کروا۔"

خواجہ نے اُسے اپنے ساتھ چمٹا کر کہا: "کیسی باتیں کرتی ہے من موہنی! کہاں وہ کہاں تُو! تیرے دل میں ایسا خیال کیوں آیا؟"

مگاچو نے کہا: "جب وہ ہم سے باتیں کر رہی تھی، تو اس کی نگاہیں صرف تیری طرف تھیں اور صرف تجھی کو دیکھتی تھی۔"

"وہ اس لیے۔" خواجہ نے جواب دیا: "کہ صرف میں اس کی بولی سمجھتا تھا اور جو بات سمجھتا ہو ہمیشہ نگاہیں اسی کی طرف کر کے بات کی جاتی ہے۔"

مگاچو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور زور زور سے رونے لگی۔ خواجہ اسے چُپ کرانے میں مصروف ہو گیا اور اُسے چُپ کراتے کراتے جرمن لڑکی کے خیالوں میں ڈوب گیا۔

پھر ایک شام ایسی آئی کہ جرمن لڑکی کا ساتھی دیر تک جنگل سے نہ لوٹا۔ خواجہ اور وہ لڑکی اُسے دیر تک تلاش کرتے رہے اور بہت دُور نکل گئے۔ لڑکی نے درختوں کے جھنڈ میں ایک بڑے سے گڑھے کو دیکھا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ خواجہ نے اس کی کلائی تھام کر کہا: "اُو نیچے

اُتر کر دیکھتے ہیں شاید اس گڑھے کے کسی کونے میں کھُدائی کر رہا ہو۔ لڑکی جھجکی تو خواجہ اس کا بازو تھام کر نیچے پھسل گیا۔ وہ لڑھکنیاں کھاتے ہری سبز گھاس اور جنگلی ساگ پر پھسلتے کھڈ کے پاتال تک پہنچ گئے۔ لڑکی کے ننگے پاؤں اور گھٹنوں پر بہت سی خراشیں آگئی تھیں۔ خواجہ نے انہیں اپنی قمیص کے دامن سے صاف کیا اور اس کے کندھے پر اپنا گال رگڑنے لگا۔ جرمن لڑکی خوف اور لذت سے کانپنے لگی اور اس کے فُل بُوٹوں کے اندر اس کے پیر پیچھے کو مڑنے لگے۔ خواجہ نے اُسے اپنی گود میں ڈال لیا اور اس کے سنہرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ جنگلی ساگ پر آرام سے لیٹی ہوئی جرمن لڑکی نے جب آنکھیں کھولیں اور اُوپر دیکھا، تو گڑھے کے کنارے منگا چو کھڑی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں ایک بڑا سا پتھر لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور جرمن لڑکی کے سر کے پاس آکر زمین میں دھنس گیا۔ لڑکی نے زور سے چیخ ماری تو خواجہ بھی اُچھلا۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ منگا چو روتی پیٹتی بین کرتی اپنے بال کھسوٹتی قبیلے کی طرف جا رہی تھی۔

جب خواجہ جرمن لڑکی کو اس کے خیمے میں چھوڑ کر جھونپڑے پر پہنچا، تو موٹے ٹہنوں والا چٹائی منڈھا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بڑی آوازیں دیں، بہت دروازہ بجایا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے کلہاڑی لے کر دروازہ کاٹنا شروع کر دیا جب چٹائی کی تہیں کٹ کر نیچے گریں اور جھونپڑے کے اندر ذرا سی روشنی داخل ہوئی، تو خواجہ نے دیکھا۔ گیلے فرش پر خُون کا ایک تالاب ہے اور اس کے کنارے گرانڈیل منگا چو لیٹی ہے اور کھکھری اس کے بائیں پستان کے نیچے پسلیوں میں گڑی ہوئی ہے۔

جرمن سیاحوں کے ساتھ واپسی پر خواجہ کلکتہ میں ملٹری پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہُوا اور بھگوڑا ہونے کی سزا میں انبالے چھاؤنی بھیج دیا گیا، لیکن جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں وہ تو خواجہ اور تازی کے زمانے کی بات ہے۔ اُس وقت ان دونوں کے بدن بولتے تھے اور ان کو زبان سے ایک دوسرے کی بولی سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر خواجہ اِس دنیا میں نہ رہے یا کراچی سے چلا جائے، تو تازی اس کی جُدائی کس طرح سے سہار سکے گی اور زندہ رہنے کے لیے کس چیز کا سہارا لے گی۔ ایک دن مَیں نے حوصلہ کر کے تازی سے یہ بات پُوچھ بھی لی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے اور وہ سر جھکا کر بولی " میرے پاس نیلے بھوتھے